نیر مسعود کی ادبی زندگی میں ''مقصد'' کی کارفرمائیاں

The Affect of Purposefulness in Naiyer Masud's Literary Life

ڈاکٹر تمثال مسعود، اسسٹنٹ انسٹرکشنل پروفیسر شکاگو یونیورسٹی، امریکہ

Abstract

Naiyer Masud, a Lucknow-based Urdu writer, is best known for his collections of short stories. In this essay, I turn to his academic work and especially to his critique of reform literature and his defense of classical writing genres including ghazal, masnavi and dastaan. Masud rejected the critiques of Urdu reformers such as Hali and Mohammed Hussain Azad's who had condemned these genres as superfluous and ultimately morally damaging. In his academic work, but also in various radio and TV programs, Masud asked readers to dismiss later critique of these genres and to appreciate them on their own terms. I argue that even though Naiyer Masud repeatedly noted that his writings never had a specific purpose or "maqsad," a close reading of his academic work reveals otherwise. Masud was committed to offering a more sympathetic and generous view of Urdu literature's classical genres.

Keywords: Naiyer Masud, Awadh, Lucknow, Classical Urdu, Reform movement, Victorian values

عام گفتگوؤں میں اور رسمی انٹرویو میں جب نیر مسعود سے پوچھا جاتا تھا کہ اُن کے لکھنے کا جواز کیا ہے، یا کہانی میں وہ کیا کہنا چاہ رہے تھے، تو وہ عموماً اِس کی وضاحت نہیں کرتے تھے بلکہ کہہ دیتے کہ جو بات تھی وہ کہانی میں کہہ دی گئی ہے۔ نیر مسعود کے ساتھ ہونے والے انٹرویو اور اُن پر لکھے جانے والے مضامین میں اُن کی افسانہ نگاری کے حوالے سے ہی زیادہ باتیں کی گئی ہیں۔ اُن میں بھی عموماً افسانوں کی تکنیک پر بات ہوئی ہے یا اُن کے افسانوں کو لکھنؤ کی نمائندگی کرنے والی کہانیاں مان کر بات کی گئی ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نیر مسعود کی کچھ کہانیوں میں لکھنؤ جھلکتا ہے مگر ایک بڑی تعداد ایسے افسانوں کی بھی ہے جو لکھنؤ اور اودھ سے تعلق نہیں رکھتے؛ جیسے سلطان مظفر کا واقعہ نویس، دھول بن، گل ستارہ، اور شیشہ گھاٹ۔ لہٰذا جس طرح اُن کے تمام افسانوں کا تجزیہ کیے بغیر نیر مسعود کو ''لکھنؤ کی نمائندگی'' کرنے والے افسانہ نگار کے خانے میں محدود کرنا درست نہیں ہے اسی طرح اُن کو صرف افسانہ نگاری کے حوالے سے سمجھنا بھی درست نہیں ہے کیونکہ اُن کے ادبی کاموں کی تعداد افسانوں کے مقابلے میں

خاصی کثیر ہے۔ایسی صورت میں اُن کے تمام افسانوں اور پورے ادبی سرمائے کا تجزیہ کر کے ہی ایک ادیب کی حیثیت سے نیر مسعود کا مکمل احاطہ کیا جا سکتا ہے۔

اس مضمون کے عنوان کی خاطر سے یہ مضمون افسانوں کے بجائے ادبی تحریروں پر مرکوز ہے۔ادبی تحریروں میں بھی بالخصوص کلاسیکی اردو نثر،نظم،اردو مرثیہ،اوراودھ کے موضوع پر لکھی گئی نیر مسعود کی تحریروں پر توجہ رکھ کر میں اُن میں مقصد کی کارفرمائیاں تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔ چونکہ نیر مسعود نے کبھی کسی ادبی تحریک یا نظریے سے خود کو وابستہ نہیں کیا تھا اس لیے آگے بڑھنے سے پہلے اِس مضمون کے موضوع کی زمین کو ہموار کرنے کے لیے ادب میں مقصد کے حوالے سے ''اصلاحی تحریک'' کا پس منظر دیکھ لینا بہتر ہوگا۔

جیسا کہ معلوم ہے کہ برطانوی کلونیولزم یعنی انگریزوں کی اقتداری موجودگی نے برصغیر میں ایک ذہنیت کو جنم دینا شروع کیا تھا۔۱۹ویں صدی سے معاشرے کی اصلاح،ادب وشاعری کی اصلاح،تعلیمی نظام کی اصلاح،عورتوں کی اصلاح،اور مذہب کی اصلاح کے مقصد سے جو اصلاحی تحریکیں وجود میں آئیں اُن کے پس منظر میں یہ ذہنیت بڑی حد تک کارفرما تھی۔ یہاں یہ بات واضح رہے کہ ''اصلاح'' کا تصور مکمل طور پر انگریزوں کی دین نہیں تھا،مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ انگریزوں کی سرپرستی میں یہ اصلاحی تحریکیں باقاعدہ منظّم طریقے سے کام کر رہی تھیں۔ اِس موضوع پر پروفیسر Gail Minault کی کتاب Secluded Scholars: Women's Education and Muslim Social Reform in Colonial India کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔

ایک بڑی حد تک اِن تحریکوں کے زیر اثر مسلم معاشرے کی اصلاح،اردو زبان اور ادب کی اصلاح کی خاطر سید احمد خان، الطاف حسین حالؔی،محمد حسین آزاد، نذیر احمد وغیرہ مصلحین کی ایک جماعت اُبھر کر سامنے آ گئی تھی۔ اِس جماعت کا ماننا تھا کہ وقت بدل رہا ہے،آنے والا زمانہ سائنس کا ہے اور ہماری زبان ''اردو'' ایک نامکمل اور بازاری زبان ہے لہٰذا یہ ''سائنس'' اور ''نیچرل'' خیالات کا ساتھ نہیں دے سکتی۔مثال کے طور پر محمد حسین آزاد اپنی تصنیف نیرنگِ خیال میں کہتے ہیں:

> تعلیم یافتہ قومیں اُسے [اردو کو] سُن کر کہتی ہیں کہ یہ نا کامل زبان ہر قسم کے مطالب ادا کرنے کی قدرت نہیں رکھتی۔۔۔اس کا نام خود کہتا ہے کہ میں علمی نہیں بازار کی زبان ہوں۔جس زبان کی تصنیفی عمر کل ۷۰۔۷۲ برس کی ہوا س کی بساط کیا؟

کچھ اِسی قسم کے خیالات کا اظہار مقدمہ شعروشاعری میں الطاف حسین حالؔی نے بھی کیا ہے:

> ایک ایسی نامکمل زبان جیسی کہ اردو ہے جس کی شاعری ابھی تک محض طفولیت کی حالت میں ہے۔ جس کے لٹریچر کی عمر اگر انصاف سے دیکھا جائے تو پچاس ساٹھ برس سے زیادہ نہیں۔
> ۔۔۔نیچرل شاعری کے لیے جیسا کہ ظاہر ہے ہماری موجودہ زبان [اردو] کافی نہیں ہے۔

اس جماعت کا یہ بھی کہنا تھا کہ ہمارا کلاسیکی اردو ادب معاشرے کو زیادہ فائدہ نہیں پہنچاتا کیونکہ بیشتر کلاسیکی شاعری اور نثر میں ''حقیقت سے دور عموماً خیالی باتیں'' اور ''لفظی بازیگری'' ہوتی ہے۔ان مصلحین نے غزل، مثنوی، اور داستان کو خاص نشانہ بنایا تھا۔اِس کا جواز یہ تھا کہ جس محبوب کے بارے میں غزل کہی جاتی ہے وہ اوّل تو خیالی ہے اور اکثر ایک مرد ہے اور معشوق کے مرد ہونے سے غزل میں امرد پرستی کے جذبات نظم کیے جاتے ہیں۔ مثنوی کے متعلق یہ بتایا گیا کہ اِس میں جو عشقیہ قصے بیان کیے جاتے ہیں وہ بے حیائی کی طرف راغب کرنے والے ہیں اور اگر اِن قصوں کو حقیقی مان لیا جائے تو یہ مثنویاں ہماری پوری قوم کے لیے بے شرمی کا باعث قرار پائیں گی۔ان مصلحین نے داستان گوئی کا تجزیہ یوں کیا کہ اس میں شروع سے آخر تک نہ صرف خیالی قصے ہوتے ہیں بلکہ جادو، سحر، اور مافوق الفطرت جیسے شرک اور کفر سے بھی یہ داستانیں بھری ہوئی ہیں۔

اوپر کہی گئی باتوں کی سند کے لیے ۱۹ رویں صدی اور بعد کے بھی اردو ادب سے بے شمار مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔اصلاحی تحریک کے زیر اثر شروع ہونے والی ناول نگاری کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ معاشرے کی اصلاح ہو اور بتایا جائے کہ ''طوطا مینا'' کے جھوٹے قصے سنانا کتنا لغو مشغلہ ہے۔اسی مقصد سے لکھے جانے والے ناولوں میں سے ایک ناول سے میں یہاں مثال دینا چاہتا ہوں۔اصلاحی تحریک سے وابستہ محمد نذیر احمد نے کئی ناول لکھے جن میں ''توبتہ النصوح'' ۱۸۷۰ء میں شائع ہوا۔اس ناول کے مرکزی کردار نصوح کو ایک موقعے پر اپنے بیٹے کلیم کے کمرے میں رائج اردو اور فارسی کتابوں سے بھری الماری ملتی ہے۔ناول میں ان کتابوں کا تذکرہ یوں کیا گیا ہے:

> کیا اردو اور کیا فارسی سب کی سب کچھ ایک ہی طرح کی تھیں۔جھوٹے قصے، بیہودہ باتیں، فحش مطلب، لچّے مضمون، اخلاق سے بعید، حیا سے دور۔(ص ۱۲۹، منشی نول کشور، ۱۹۲۱ء)

آگے بڑھ کر ناول میں اِن کتابوں کا انجام یوں دکھایا گیا ہے:

> نصوح ان کتابوں کی جلد کی عمدگی، خط کی پاکیزگی، کاغذ کی صفائی، عبارت کی خوبی، طرز ادا کی برجستگی پر نظر کرتا تھا تو کلیم کا کتاب خانہ اس کو ذخیرۂ بے بہا معلوم ہوتا تھا۔مگر معنی و مطلب کے اعتبار سے ہر ایک جلد سوختنی اور دریدنی تھی۔۔۔۔۔۔[نصوح] بار بار کتابوں کو الٹ الٹ کر دیکھتا تھا اور رکھ دیتا تھا۔آخر کار یہی رائے قرار پائی کہ ان کا جلا دینا ہی بہتر ہے۔چنانچہ بھری الماری کتابیں لکڑی کندے کی طرح اوپر تلے رکھ کر آگ لگا دی۔(ص ۱۲۹، منشی نول کشور، ۱۹۲۱ء)

کتابوں کے جلائے جانے پر نصوح کی بیوی کو تشویش ہوتی ہے کہ کتاب کی لوگ عزت کرتے ہیں لیکن اِن کتابوں میں ایسی کیا بات تھی کہ نصوح نے ان کو جلا دیا۔نصوح کی زبانی اس کا سبب سنیے:

> جن کتابوں کو میں نے جلایا ان کے مضامین شرک اور کفر اور بے دینی اور بے حیائی اور فحش اور بد گوئی

اور جھوٹ سے بھرے ہوئے تھے۔(ص ۱۳۲،منشی نول کشور،۱۹۲۱ء)

ناول میں جلائی جانے والی کتابوں کی فہرست دیکھنے سے بات واضح ہو جائے گی کہ ناول کا کردار نصوح کس ادبی سرمائے کو مسترد کر رہا تھا: کلیاتِ آتش، واسوخت امانت، فسانۂ عجائب، قصۂ گل بکاولی، آرائشِ محفل، مثنوی میر حسن، غزلیاتِ جرکین، ہزلیاتِ میر جعفر زٹلی، مرزا سودا کے قصائد اور ہجو، دیوانِ جان صاحب، بہارِ دانش با تصویر، اندرسبھا، میر انشااللہ خاں کی دریائے لطافت، اور کلیاتِ رند۔ مسترد کرنے والی ان کتابوں کی فہرست میں نظیر اکبرآبادی کا دیوان بھی شامل ہے جس کی حیثیت اور مقام کا فیصلہ کوئی ادیب یا بالغ النظر کردار نہیں کرتا بلکہ نصوح کا سب سے چھوٹا اور نوعمر بیٹا سلیم کرتا ہے:

> چونکہ بھائی جان [کلیم] نے دیوان [دیوانِ نظیر اکبرآبادی] کی بہت تعریف کی تھی، میں نے اُس کو نہایت شوق سے کھولا تو پہلے ہی چوہوں کا اچار نکلا۔ اس کے مضمون سے میری طبیعت کچھ ایسی کھٹی ہوئی کہ میں نے دونوں کتابیں پھیر دیں۔(ص ۱۳۰،منشی نول کشور،۱۹۲۱ء)

مراۃ العروس اور بنات النعش کے دیباچوں میں نذیر احمد نے اپنے مقصد کو واضح طور بتایا ہے کہ وہ یہ ناول تفریح کے لیے فکشن نہیں لکھ رہے تھے بلکہ باقاعدہ معاشرے کی اصلاح اور عورتوں کی تعلیم کے مقصد کے تحت یہ ناول لکھ رہے تھے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ اس طرح کے ناول اردو کے ساتھ ہندی اور دوسری کئی زبانوں میں بھی لکھے جا رہے تھے اور اُن ناول نگاروں کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے انگریزی حکومت نے ۱۸۶۸ء سے انعامی مقابلہ بھی شروع کیا تھا۔ اس پر کشش انعامی مقابلے میں ایک قلیل مدت میں ہی قریب ایک ہزار سے زیادہ اردو اور ہندی ناول انعامی مقابلے میں پیش کیے گئے جن میں نذیر احمد کو اُن کے ناول ''مراۃ العروس'' اور ''بنات النعش'' کے لیے انعام بھی مل چکے تھے۔ ۱۸۷۳ء میں سررشتۂ تعلیم ممالک مغربی وشمالی کے انگریز ڈائرکٹر میتھیو کمپسن نے ''توبۃ النصوح'' پر تفصیلی تبصرہ کرنے کے بعد ان جملوں پر اپنا ریویو ختم کیا ہے:

> ہندوستانی مولوی نذیر احمد کے نہ صرف اِس لیے مشکور ہوں گے کہ ان کے نُقص اُس [توبۃ النصوح] میں عموماً ظاہر کیے گئے ہیں بلکہ اس واسطے بھی کہ اُن نقصوں کے رفع کرنے کا چارۂ کار بھی بتا دیا گیا ہے۔ میری رائے میں مصنف [نذیر احمد] مستحق انعام اوّل درجے یعنی ایک ہزار روپئے کا ہے۔

بہرحال، سال ۱۸۷۴ء کے انعامی مقابلے میں ایک بار پھر نذیر احمد کو اُن کے ناول ''توبۃ النصوح'' کے لیے اوّل درجے کا ایک ہزار روپے کا انعام ملا۔ اس انعام کے علاوہ میتھیو کمپسن کو یہ ناول اس قدر پسند آیا کہ انھوں نے اِس کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ اِس کے بعد آنے والے اگلے ۶۰/برس میں دوسری کئی وجہوں کے ساتھ سیاسی

بے چینی کے سبب ان اصلاحی تحریکوں کے نظریے میں کچھ تبدیلی آئی اور پھر ہندوستان کی انگریزی حکومت سے آزادی کے باب میں ان تحریکوں کے مزاج اور مقصد میں مزید تبدیلیاں آئیں جن میں شاید ترقی پسند تحریک آخری اور نمایاں صورت تھی۔ اصلاحی تحریک سے ترقی پسند تحریک کا مزاج بھلے ہی مختلف ہو لیکن ''اصلاح'' کا عنصر قریب سو برس بعد ترقی پسند تحریک میں اُس وقت بھی بہت نمایاں طور پر موجود تھا جس وقت نیر مسعود نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا کی۔

نیر مسعود نے ۱۹۶۵ء میں اردو میں ڈی فل کی سند حاصل کی۔ انھوں نے رجب علی بیگ سرؔور کو اپنی تحقیق کے لیے منتخب کیا۔ ان کی ڈی فل کے تحقیقی مقالے کا عنوان تھا: رجب علی بیگ سرؔور: حیات اور کارنامے۔ اردو ادب میں عموماً رجب علی بیگ سرؔور کی حیثیت ایک داستان گو، مقفع اور مسجع نثر لکھنے والے کلاسیکی نثر نگار کی ہے جن کا ذکر اُن کی داستان ''فسانۂ عجائب'' کے ساتھ لازماً آتا ہے۔ یہ وہی ''فسانۂ عجائب'' ہے جس کو نذیر احمد نے معاشرے کی اصلاح کی خاطر اپنے ناول ''توبتہ النصوح'' میں جلا دیا تھا۔ اس کے جلائے جانے کے تقریباً سو برس بعد تک سرؔور کی نثر کو ''مصنوعی طرز'' ہی مانا جارہا تھا، مثلاً مقبول تنقید نگار کلیم الدین احمد نے اپنی کتاب ''اردو زبان اور فنِ داستان گوئی'' میں ''فسانۂ عجائب'' کے بارے میں یہی رائے دی ہے۔ لیکن نیر مسعود نے سرؔور کی تحریروں کا جائزہ لے کر ۱۸۷۰ء سے اپنے زمانے کو محیط اِس عمومی نظریے کو غلط ثابت کیا کہ سرور بہت پر تکلف، رنگین اور مصنوعی نثر لکھتے ہیں۔ اپنے ایک مضمون ''رجب علی بیگ سرؔور کے نثری اسالیب'' کے اختتامیہ میں نیر مسعود لکھتے ہیں:

> ہماری بیشتر تنقید نے سرؔور کے ساتھ کچھ یک طرفہ سا رویہ اختیار کر رکھا ہے اور ان کی نثر کو بے لطف، پر تکلف، اور از کار رفتہ قرار دے کر قریب قریب مسترد کر دیا ہے۔ اپنے کلاسیکی سرمائے کے ساتھ یہ سلوک مناسب نہیں ہے اور ہماری ادبی اور تخلیقی نثر کی تاریخ میں سرؔور زیادہ توجہ اور ہمدردانہ مطالعے کا تقاضا کرتے ہیں۔

اپنے اِس مضمون میں نیر مسعود نے بھلے ہی نذیر احمد کے ناول ''توبتہ النصوح'' میں ''فسانۂ عجائب'' کی ادبی حیثیت کو مسترد کر کے اُس کے جلائے جانے کا حوالہ نہ دیا ہو لیکن وہ اس قسم کے رویے سے بخوبی واقف تھے اسی لیے انھوں نے کہا کہ '' کلاسیکی سرمائے کے ساتھ یہ سلوک مناسب نہیں ہے۔'' نہ صرف اپنے اِس مضمون میں بلکہ عموماً وہ اپنی تحریروں میں اصلاحی تحریک کا حوالہ نہیں دیتے تھے۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ برطانوی کلونیولزم سے نظر ہٹا کر ادب کا مطالعہ کرنے کے رجحان کی اردو ادبیات میں خاصی کمی ہے۔ ایسی صورت میں اصلاحی تحریک اور برطانوی کلونیولزم کا حوالہ نہ دے کر نیر مسعود نے اردو کلاسیکی سرمائے کے مطالعے کے کئی اہم پہلوؤں پر غور کرنے کی تحریک دی۔ مثال کے طور پر اردو ادبیات میں عام تصور یہی ہے کہ اردو نثر کی توسیع اور ترقی اصلاً اصلاحی تحریک اور برطانوی کلونیولزم کی مرہون ہے ورنہ تو پہلے، یعنی کلاسیکی اردو نثر میں مصنوعی انداز کی زبان میں جھوٹے قصے ہی ہوتے تھے۔ نیر مسعود نے اِس خیال کو مسترد کیا اور سرؔور پر اپنے تحقیقی کام کے ذریعے اردو نثر کی تاریخ کا مطالعہ کرنے کا ایک عمیق اور مختلف نظریہ

پیش کیا۔ اپنے اِس نظریے میں انھوں نے ''ہمدردانہ مطالعہ'' کو بنیاد بنایا ہے جس کی اہمیت آگے آنے والی مثالوں سے واضح ہوتی جائے گی۔ فی الحال ایک مثال کے لیے رجب علی بیگ سرور پر ان کے تحقیقی کاموں کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرور کی نثر کا جائزہ انھوں نے صرف ''فسانۂ عجائب'' کو پڑھ کر نہیں لیا بلکہ ایک محتاط محقق اور ذمہ دار تنقید نگار کی حیثیت سے سرور کی داستان نویسی، تاریخ نگاری، ترجمہ نگاری، اور خطوط نویسی کا بغور مطالعہ کیا۔ نیر مسعود کے اس التزام کو صرف اردو نہیں بلکہ پورے مشرقی وسطی ایشیا اور مشرقِ وسطہ کے حوالے سے ''Orientalism'' کے پس منظر میں دیکھا جائے تو اُن کے اِس روّیے کی اہمیت کا دائرہ خاصا وسیع ہو جاتا ہے۔ اس موضوع پر Edward W. Said کی ۱۹۷۸ء میں شائع ہونے والی عالمی شہرت یافتہ کتاب Orientalism کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہے۔ اپنی تنقید میں سعید نے بحث کی ہے کہ مشرق کا مطالعہ کرنے کے لیے مغرب نے Orientalism یعنی مشرقیات کا موضوع اختراع کیا تو اس کے مشرق پر کیا اثرات ہوے۔

اتنی بات کرنے کے بعد میں کہہ سکتا ہوں کہ نیر مسعود نے اپنے ادبی سفر کی ابتدا میں یہ واضح کر دیا تھا کہ وہ برطانوی کلونیولزم، اصلاحی تحریکوں اور مصلحین کی تنقیدوں سے قطعی طور پر نہ مرعوب ہوں گے اور نہ ہی مرغوب ہوں گے بلکہ اردو کے کلاسیکی ادبی سرمائے پر لگائی جانے والی غلط اور نامناسب تہمتوں کا دفاع کریں گے۔ دفاع کرنے کا یہ رجحان نیر مسعود کی ادبی ذمہ داری کے احساس کو ظاہر کرتا ہے۔ میں اِس ذمہ داری کے احساس کو اُن کی تقریباً پوری ادبی زندگی کا محرک مانتا ہوں اور یہ بھی مانتا ہوں کہ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کی شروعات ''رجب علی بیگ سرور: حیات اور کارنامے'' میں جس نظریے یعنی ''ہمدردانہ مطالعہ'' کو بنیاد بنایا تھا اُس پر وہ قائم بھی رہے۔

نثر کے بعد اِس مضمون کے دوسرے حصے یعنی اردو شاعری کے تعلق سے نیر مسعود کے کام اور رویے کی بابت چند باتیں دیکھ لینے کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ ۱۹/ویں صدی سے شروع ہونے والی اصلاحی تحریک کا خاص نشانہ اردو شاعری تھا لہٰذا شاعری کی اصلاح کے لیے شائع ہونے والی کتابوں اور مضامین کی فہرست طویل ہے جن میں شاید سب سے اہم الطاف حسین حالی کی ۱۸۹۰ء میں شائع ہونے والی کتاب ''مقدمۂ شعر و شاعری'' ہے۔ یہ ایک وجہ ہے کہ اِس مضمون میں اکثر مثالیں اسی کتاب سے دی جائیں گی، دوسری وجہ یہ ہے کہ الگ الگ کتابوں کے حوالے دے کر میں قاری کو الجھانا نہیں چاہتا۔ اور تیسری اہم وجہ یہ ہے کہ نیر مسعود کے والد مسعود حسن رضوی ادیب نے اپنی مقبول کتاب ''ہماری شاعری'' حالی کی تنقید کے سلسلے میں ۱۹۲۸ء میں شائع کی تھی۔ اپنی کتاب کے دیباچے میں ادیب لکھتے ہیں:

> اِس [الطاف حسین حالی کی ''مقدمۂ شعر و شاعری''] کی تصنیف کا خاص مقصد یہ ہے کہ اردو شاعری کے نقائص دکھائے جائیں اور اُن کی اصلاح کی تدبیریں بتائی جائیں۔۔۔۔[''ہماری شاعری'' کا اہم مقصد یہ ہے کہ] اردو شاعری کے بے عیب اور قابلِ تعریف حصے کو نمایاں کر کے اُس کا وقار تعلیم یافتہ طبقے کی نگاہوں میں قائم کیا جائے۔۔۔ یعنی ''ہماری شاعری'' ''شعر و شاعری'' کا جواب

نہیں ہے بلکہ اس کا تتمہ ہے۔

کتاب کے دیباچے میں بتائے گئے مقصد کے حصول کے لیے ادیب نے اصلاحی تحریک، حالی، مغربی تنقید؛ خاص کر انگریز دانشوروں کی تنقید سے بحث کر کے کلاسیکی اردو شاعری کی خوبیوں کو نمایاں کیا ہے اور جو اعتراض کیے جا رہے تھے اُن کا جواب دیا ہے۔ اپنے والد کے اِس مایہ ناز کام کے بعد نیر مسعود نے کلاسیکی شاعری کے متعلق جو تنقیدی تحریریں پیش کیں ہیں اُن تحریروں کا جائزہ لے کر میں یہ سمجھنے کی کوشش کروں گا کہ نیر مسعود نے حالی کی تنقید کے متبادل اردو کلاسیکی شاعری کے مطالعے کا کیا طریقۂ کار پیش کیا ہے۔ ''ہماری شاعری'' کے علاوہ مسعود حسن رضوی ادیب نے شاعری، نثر، مرثیہ، اور اودھ؛ واجد علی شاہ پر کثیر تعداد میں تحریریں شائع کی تھیں۔ نیر مسعود نے بھی کم و بیش اِن موضوعات پر کام کیا۔ یہ ایک وجہ ہے کہ بیشتر نیر مسعود کو اُن کے والد سے مربوط کر کے دیکھا جاتا ہے مگر یہ اُسی حد تک درست ہے جہاں انھوں نے اپنے والد کے نقطۂ نظر کا اتباع کرتے ہوے اُن کے کاموں کی توسیع کی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک مستقل ادیب کی حیثیت سے تحقیق، تنقید، اور افسانہ نگاری کے حوالے سے نیر مسعود کی ادبی شخصیت کا احاطہ کیا جانا چاہیے۔

حالی نے ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں ۱۷ اروِیں صدی کے ایک انگریز شاعر جان ملٹن کی بتائی ہوئی شاعری کی تعریف کو خاصی حد تک بنیاد بنا کر اردو شاعری کی تنقید کی ہے۔ یہاں جان ملٹن اور حالی کی تنقید کی تفصیل اور تفسیر پر بحث کرنے کا تو موقع نہیں ہے لیکن اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے تحقیق کر کے یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ مشرقی ادب کے لیے حالی مغربی ادیب کی تنقید کو مستند کیوں مان رہے تھے؟ اور یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ حالی نے ''بذاتِ خود'' کس حد تک جان ملٹن کا مطالعہ کیا تھا۔ فی الحال غزل کے مضامین اور اردو زبان کے متعلق ''مقدمہ شعر و شاعری'' سے یہ مثالیں دیکھیے:

> ہم لوگ جب غزل لکھ کر مشاعرے میں جاتے ہیں تو اپنے دل میں سمجھتے ہیں کہ ہم سب سے الگ اور اچھوتے مضمون باندھ کر لے چلے ہیں مگر غزل کو دیکھیے تو وہی انگریزی مٹھائی کا بکس ہے کہ مٹھائیوں کی شکلیں مختلف ہیں لیکن مزا سب کا ایک ہے۔

میں انگریزی مٹھائیوں کا ماہر تو نہیں ہوں لیکن آج بھی کھانے کی میز پر تواضع کے لیے پر تکلف انگریزی مٹھائیوں کی بیسیوں قسمیں موجود ہیں۔ اِن مٹھائیوں کا تاریخی پس منظر، اِن کے ذائقوں اور خوشبوؤں کی تفصیل ایک الگ دنیا کھولتی ہے جس کا مطالعہ کرنے کو پچاسوں کتابیں موجود ہیں۔ لہٰذا انگریزی مٹھائی کے حوالے سے غزل کے مضامین کی یکسوئی پر حالی نے جو الزام لگایا ہے اس پر بات کرنا لاحاصل ہے۔ غزل کی محدود لفظیات اور اصطلاحات کو بھی یہ مصلحین اردو شاعری کی بڑی کمزوری مان رہے تھے کہ حقیقی جذبات کو نظم میں منتقل کرنے میں اردو

پوری طرح سے اہل نہیں ہے جبکہ مرزا غالبؔ اپنے شاگردوں کو تنبیہ کرتے تھے کہ غزل کی رائج لفظیات سے باہر نہ نکلنا چاہیے۔ اِس کی مثال کے لیے غالبؔ کے خطوط دیکھے جاسکتے ہیں۔ بہرحال مرزا غالبؔ کے ہی شاگرد حالیؔ غزل کی زبان کے بارے میں لکھتے ہیں:

> جس طرح ہماری غزل کے مضامین محدود ہیں اسی طرح اس کی زبان بھی ایک خاص دائرے سے باہر نہیں نکل سکتی کیونکہ چند معمولی مضمون جب صدیوں تک برابر رٹے جاتے ہیں تو زبان کا ایک خاص حصہ ان کے ساتھ مخصوص ہو جاتا ہے جو کہ زبانوں پر بار بار آنے اور کانوں سے بار بار سننے کے سبب زیادہ مانوس اور گوارا ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر ان الفاظ کی جگہ دوسرے الفاظ جو انھیں کے ہم معنی ہوں استعمال کیے جائیں تو غریب اور اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔

نیر مسعود نے اِن دونوں الزاموں یعنی محدود مضمون اور محدود لفظیات کے جواب میں براہِ راست تو کچھ نہیں لکھا لیکن اُن کی کتاب ''تعبیر غالبؔ'' کا خاص اِس نظر سے مطالعہ کیا جاسکتا ہے جس میں انھوں نے غالبؔ کے چند شعروں میں موضوعات کی نوعیت اور لفظوں کی معنوی تہوں پر بحث کیہے۔ حالیؔ اور دوسرے مصلحین نے غزل کی اِن کمزوریوں کے ضمن میں لکھنوی غزل کے متعلق یہ فیصلہ صادر کر دیا تھا کہ اس میں ''لفظوں کی بازیگری'' کے سوا کچھ نہیں اور غزل کہنا محض وقت کی بربادی ہے۔ اپنے ایک مضمون ''لفظی رعایتیں اور لکھنوی شاعری'' میں نیر مسعود نے براہ راست اِس الزام کی تردید کی ہے:

> ۔۔۔ یہ طے کر لیا گیا کہ لکھنوی شاعری میں الفاظ کی بازیگری کے سوا اور کوئی خاص بات نہیں ہے۔۔۔اس طرز [الفاظ کی بازیگری] کے شاعروں نے لفظ کو محض معنی و موضوع کے اظہار میں صرف کر دینا کافی نہ سمجھا بلکہ خود لفظ کو بھی اپنا موضوعِ فن بنایا۔ان شاعروں نے لفظ کے دوسرے مفاہیم کی طرف محض اپنے اندازِ بیان سے ذہنوں کو منتقل کر کے اس لفظ کی ثانوی قوتوں کو بھی ابھارنا ضروری سمجھا۔ جب ایک لکھنوی شاعر نے کہا تھا:
>
> کیا ہم کو جھنکاتی ہے کنویں چاہ تمہاری   لہرا کے کبھی جاتے ہیں دریا کبھی تالاب
>
> تو اس نے یہ نہ سوچا ہوگا کہ کچھ مدت کے بعد قاری اس شعر کو تضحیکی مسکراہٹ کے ساتھ پڑھے گا اور ''لہرا کے''، ''دریا''، ''تالاب'' اور اس سے بھی زیادہ ''کنویں'' اور ''چاہ'' کی رعایتِ لفظی اس کو بدمزہ کر دے گی۔ بے چارے شاعر نے تو ''چاہ'' کے لفظ میں دہری قوت پیدا کی تھی۔ اس قوت سے قطعِ نظر کر لیجیے تو محبت کا مفہوم ادا کر دینے کے بعد لفظ ''چاہ'' کا کام ختم ہو جاتا ہے، گویا یہ ایک اینٹ تھی جو معنی کی دیوار تعمیر کرنے میں صرف ہو کر دوسری اینٹوں کے انبوہ میں گم ہوگئی۔ لیکن شاعر نے اس لفظ پر غور کیا اور شعر کے معنی میں اضافہ کیے بغیر صرف اس لفظ کی معنویت بڑھا دی۔ یہ لفظ

پروری کی بدنام ترین قسم یعنی رعایتِ لفظی تھی جو رعایتِ لفظی کے لیے بدنام ترین شاعر یعنی امانتؔ لکھنوی کے کلام سے پیش کی گئی تھی۔ فی الحال یہی تسلیم کرلیا جائے کہ رعایتِ لفظی نے اس شعر کی معنویت میں کوئی اضافہ نہیں کیا لیکن یہ بھی تو ماننا پڑے گا کہ رعایتِ لفظی سے اِس شعر کی معنویت میں کوئی کمی بھی نہیں آئی۔

نیر مسعود کے مضمون کے اِس اقتباس کے پڑھنے سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ رعایتِ لفظی کو وہ اردو غزل کی شعریات میں ایک امتیازی مقام دیتے ہیں جبکہ اصلاحی تحریک کے علمبردار اِس کے لیے ''لفظوں کی بازیگری'' جیسی ایک عامیانہ قسم کی اصطلاح کا استعمال کر رہے تھے۔ نذیر احمد نے اپنے ناول ''توبتہ النصوح''، جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے، اُس میں جو کتابیں جلائی ہیں اُن میں امانتؔ لکھنوی کی واسوخت بھی موجود ہے اور یہاں نیر مسعود رعایتِ لفظی کی مثال دینے میں انھیں امانتؔ کا شعر پیش کر رہے ہیں۔ لفظوں کی بازیگری قسم کی دوسری نامناسب تہمتیں جو کلاسیکی اردو شاعری اور نثر پر لگائی گئیں ان کے متعلق نیر مسعود نے کئی اہم مضامین لکھے۔ ظاہر ہے ان تمام مضامین کے حوالے دینے کی یہاں گنجائش تو نہیں ہے مگر اس موضوع پر ان دو مضامین کے عنوان ہی دیکھ لینے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ کیا کام کر رہے تھے، جیسے: ''کلاسیکی شاعری کس طرح پڑھی جائے'' اور ''اردو شعریات کی چند اصطلاحیں۔'' ۱۹۷۴ء میں لکھے گئے نیر مسعود کے مضمون ''کلاسیکی شاعری کس طرح پڑھی جائے'' کا عنوان ہی یہ واضح کر رہا ہے کہ یہ مضمون انھوں نے کس مقصد سے لکھا تھا۔ یہاں اِس مضمون سے ایک اقتباس نقل کرنا مناسب معلوم ہوگا:

> اردو شاعری کی زبان میں تغیر کی رفتار بہت سست ہے، لیکن بہر حال منطقی طور پر ایک وقت ایسا آ سکتا ہے جب یہ زبان اتنی بدل جائے کہ اس کے مقابلے میں کلاسیکی شاعری کسی دوسری زبان کی شاعری معلوم ہونے لگے۔ اس وقت البتہ یہ مسئلہ پریشان کن ہو سکتا ہے کہ کلاسیکی شاعری کس طرح پڑھی جائے۔ لیکن اُس وقت بھی اس مسئلے کا حل یہی ہوگا کہ کلاسیکی شاعری کی زبان کو سمجھ لیا جائے۔ کلاسیکی شاعری کی زبان کو سمجھنے کے لیے پرانے وقتوں سے لے کر اب تک کے سیاسی، سماجی، معاشی، تغیرات وغیرہ کا عالمانہ مطالعہ اتنا مفید نہ ہوگا جتنا براہِ راست اس کلاسیکی شاعری کا ہمدردانہ مطالعہ۔ اس ہمدردانہ مطالعے کے نتیجے میں آج بھی اور آئندہ بھی کلاسیکی شاعری کے زمانی فاصلے کا احساس مٹ سکتا ہے اور وہ نئے ذہن کے قاری کو بھی اپنے زمانے اور اپنے دل کی آواز معلوم ہو سکتی ہے۔

اِس سے پہلے رجب علی بیگ سرورؔ کی نثر کے ضمن میں جو مثال پیش کی گئی تھی اس میں نیر مسعود نے کلاسیکی نثر کے لیے ''ہمدردانہ مطالعہ'' کرنے کا تقاضا کیا تھا اور اب یہاں کلاسیکی شاعری کے لیے بھی وہ ''ہمدردانہ مطالعہ'' کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ میرا ماننا ہے کہ آج یعنی post-colonialism کے اردو ادیب ''ہمدردانہ مطالعہ''

کے نقطۂ نظر سے اگر اردو ادب کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو اُن کی تحقیقی اہمیت کا دائرہ شاید زیادہ وسیع ہوسکتا ہے۔ اِس نقطے کے کچھ پہلوؤں کی وضاحت کرنے کے لیے میں بحث کے دوسرے حصے میں داخل ہو رہا ہوں کہ نیر مسعود کلاسیکی اردو ادب کے لیے ''ہمدردانہ مطالعہ'' کرنے کا مطالبہ کیوں کر رہے تھے۔ اِس سوال کے جواب میں وہ مقصد مضمر ہیں جو نیر مسعود کو ''ادیب کی ذمہ داری'' کے احساس نے دیے تھے۔ مثال کے طور پر ایک ادیب سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ناانصافی کے خلاف آواز اٹھائے۔ اصلاحی تحریک نے جو نظریہ اور رویہ اختیار کیا تھا اُس کو نیر مسعود نے کلاسیکی ادب کے ساتھ ناانصافی مانا اور منصفانہ تحقیق کر کے ایسی تحریریں پیش کیں جن سے اِس ناانصافی کی تلافی ہوسکے۔ جن تحریروں کو اصلاحی تحریک از کار رفتہ بتا کر مسترد کر رہی تھی نیر مسعود نے بتایا کہ یہ تحریریں کئی لحاظ سے ہمارا قیمتی سرمایہ ہیں؛ جیسے گذشتہ زمانے کی تاریخ اور تہذیب کے مطالعے کے لیے یہ تحریریں تاریخی ماخذ کی طرح استعمال کی جا سکتی ہیں۔ میں اس نقطے کو بہت اہم مانتا ہوں اس لیے اس کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے ۱۹ویں صدی کے سیاسی منظر نامے کے حوالے سے چند باتوں کی نشاندہی کرنا ضروری ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی سے حکومت کرنے کا اقتدار سلطنتِ برطانیہ کو منتقل ہو گیا تھا۔ اب تک ایسٹ انڈیا کمپنی پر یہ فرض عائد نہ تھا کہ وہ یہاں کے معاشرتی نظام میں ''اصلاح'' کی فکر کرے لیکن سلطنتِ برطانیہ نے یہاں کے معاشرے کی اصلاح کی باقاعدہ طور پر ذمہ داری سنبھال لی۔ اخلاقیات میں اصلاح کر کے ایک تہذیب یافتہ معاشرے کی تشکیل دینے کی اِس ذمہ داری کے احساس کو Victorian morality تحریک سے بھی وابستہ کیا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ ملکہ وکٹوریہ کے دورِ حکومت (۱۹۰۱-۱۸۳۷ء) میں برطانیہ میں شروع ہونے والی اِس تحریک نے ہندوستان کے معاشرے پر بھی گہرا اثر ڈالا تھا۔ اردو ادب کے تعلق سے اوپر جس اصلاحی تحریک کا ذکر ہوا ہے اُس کو کسی حد تک Victorian morality کا نتیجہ مانا جا سکتا ہے۔ برطانوی کلونیولزم کے زیرِ اثر تخلیق ہونے والے ادب کا مطالعہ کرنے میں کئی باتوں کا خاص خیال رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے جیسے یہ دیکھنا کہ مصلحین اپنی تحریروں میں معاشرے اور ادب کی جو عکاسی اور تنقید کر رہے تھے وہ کس حد تک Victorian morality سے متاثر ہے۔ یہ نہایت نازک اور پیچیدہ مرحلہ ہے۔ چونکہ اِس موضوع پر بات کرنے کے لیے ایک الگ مضمون درکار ہے اِس لیے یہاں صرف ایک مثال میں اِس پیچیدگی کے کچھ اشارے دیکھے جا سکتے ہیں۔ اخلاق کی پاکیزگی کی حفاظت کے خیال سے سلطنتِ برطانیہ نے کئی اقدام کیے تھے جن میں ۱۸۶۰ء کے آس پاس ایک قانون ''۳۷۷'' بنا کر ہم جنس پرستی کے فعل کو جرم قرار دے دیا گیا تھا۔ ایسی صورت میں غزل کے معشوق کی جنس کے مذکر ہونے کی بنا پر ''مرد'' شاعر امرد پرستی کے مرتکب ٹھہرائے گئے تھے اور اردو غزل خلافِ فطرت اور مخربِ اخلاق بتائی جانے لگی۔ اِس معاملے نے اردو شعریات کا باقاعدہ ایک نیا باب کھول دیا جس کا عنوان تھا: غزل کا محبوب کون ہے؟ اِس سلسلے میں بہت کچھ لکھا جاتا رہا ہے، جن میں عبدالحلیم شرر کا مضمون ''ہمارے شعراء کا معشوق''

بہت دلچسپ ہے،مگر ابھی تک،کم از کم میری نظر میں،کوئی ایسا سنجیدہ،مناسب،اور معقول کام نہیں ہوا ہے کہ جس میں اِس سوال کا تشفی بخش جواب دیا گیا ہو۔

بہرحال برطانوی کلونیلزم کے زیر اثر اور بعد میں بھی ''مسلم معاشرہ اور تہذیب'' کے حوالے سے جو کام ہوے ان کا تجزیہ کرنے کے نازک اور پیچیدہ مرحلے میں کلاسیکی ادب بہت مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔ یہ ایک خاص وجہ ہے کہ اردو کے کلاسیکی سرمائے کو تہذیب کے سمجھنے کا ایک اہم ذریعہ مانتے ہوے نیر مسعود ''ادب کی تہذیبی اہمیت'' پر خاص توجہ رکھتے ہیں۔انھوں نے اِس سرمائے کی مدد سے اپنی تحریروں میں گذشتہ معاشرے کے خطوط کو ابھار کر ایک خاکہ سا بنا کر پیش کیا ہے۔ اِس خاکے کی مدد سے گذشتہ تہذیب کو سمجھا جا سکتا ہے۔ خاکہ سازی کا یہ عمل اُن کی بیشتر ادبی تحریروں میں اور کچھ افسانوں میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ فی الحال اِس نقطے کی مزید وضاحت کے لیے اِس مضمون کے تیسرے حصے یعنی اردو مرثیے پر کچھ بات کرنا مناسب ہوگا۔

جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے کہ اردو مرثیے میں صرف بین نہیں ہوتے بلکہ عرب معاشرے کے برعکس ہندوستانی معاشرے کی تصویر کشی کی جاتی ہے۔ اِس میں خوشی اور غم کے موقعوں کے مقامی رسم و رواج کا تذکرہ ملتا ہے،مختلف موقعوں پر مختلف مرتبے کے لوگوں کے ردِعمل دکھائے جاتے ہیں۔ اِس لحاظ سے اردو مرثیہ یہاں کی تہذیب کا مطالعہ کرنے میں بھی اہم مقام رکھتا ہے۔شاید یہ ایک خاص وجہ ہے کہ نیر مسعود نے مرثیے کو اپنی ادبی سرگرمیوں کا مرکز بنالیا تھا اور وہ اپنی تحریروں میں مرثیے کی اس افادیت پر خاص توجہ دلاتے ہیں۔مرثیے کے مطالعے میں نیر مسعود کے والد مسعود حسن رضوی ادیبؔ ایک ممتاز اور معروف مقام رکھتے ہیں۔مرثیے کے حوالے سے اُن کا ذخیرہ بھی شہرت رکھتا ہے۔اردو مرثیے پر اپنے کئی کاموں میں نیر مسعود نے شاید سب سے زیادہ حوالے اپنے والد کی تحریروں اور ذخیرے سے اخذ کیے ہیں۔مگر اِس کے برخلاف کئی ادیبوں نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ عراق کے ریگستانی علاقے کربلا میں پیش آنے والے واقعے کو ہندوستان کے لکھنؤ اور دہلی کے پس منظر میں بیان کرنا مناسب نہیں ہے، اور اِس لیے یہ بیان حقیقت سے دور بھی ہے۔اس خیال کی بازگشت کو اصلاحی تحریک میں بھی سنا جا سکتا ہے جہاں غزل اور مثنوی کے برخلاف اردو مرثیہ نگاروں پر صریحاً ''لفظوں کی بازیگری'' اور ''خیالی مضمون آفرینی'' کی تہمت تو نہیں لگائی جاتی لیکن مرثیے میں شاعرانہ ہنر دکھانے کی مخالفت کی جاتی ہے۔''مقدمۂ شعر و شاعری'' سے ہی ایک مثال دیکھیے جہاں الطاف حسین حالیؔ شاعروں کو میر انیسؔ کا اتباع کرنے سے روکتے ہوے کہتے ہیں:

> بہرحال ہم میر انیس کے مرثیے کی اور نئی طرز کی مرثیہ گوئی کی دل سے داد دیتے ہیں لیکن نئی دھن کے شاعروں کو ہرگز یہ صلاح نہیں دیتے کہ مرثیہ گوئی میں ان کا یا اور مرثیہ گویوں کا اتباع کریں۔ اوّل تو یہ امید نہیں کہ اس خاص طرز میں اب کوئی شخص ان کا سا کمال حاصل کر سکے۔ دوسرے مرثیے میں رزم بزم اور فخر و خودستائی اور سراپا وغیرہ کو داخل کرنا، لمبی لمبی تمہیدیں اور توطئے باندھنے، گھوڑے

اورتلوار وغیرہ کی تعریف میں نازک خیالیاں اور بلند پروازیاں کرنی اور شاعرانہ ہنر دکھانے مرثیے کے موضوع کے بالکل خلاف ہیں اور بعینہ ایسی بات ہے کہ کوئی شخص اپنے باپ یا بھائی کے مرنے پر اظہار حزن و ملال کے لیے سوچ سوچ کر رنگین اور مسجع فقرے انشا کرے۔اور بجائے حزن و ملال کے اپنی فصاحت و بلاغت کا اظہار کرے۔

اِس کے علاوہ اردو مرثیے کو ایک خاص فرقے سے منسوب کر کے اس کو مذہبی شاعری کے زمرے میں محدود بھی کیا گیا۔ظاہر ہے ایسا کرنے سے اردو شاعری کی ادبی حیثیت کو نقصان ہی پہنچا، حالؔی اور دوسرے کئی ادیب مرثیے کو اسی نظر سے دیکھتے تھے بلکہ یہ تعصب کچھ حد تک آج بھی موجود ہے۔ نیر مسعود نے مرثیے کے مطالعے کو ادبی اور تہذیبی تاریخ کے سمجھنے کے لیے بے حد ضروری مانتے ہوئے اِس کو ''مذہبی نظم'' کے خانے میں محدود نہیں ہونے دیا۔ اِس مقصد سے لکھی گئی تحریروں کے نتیجے میں ''دولھا صاحب عروؔج''، ''مرثیہ خوانی کا فن''، ''بزمِ انیؔس''، ''معرکۂ انیؔس و دبیؔر''، ''انیؔس سوانح'' جیسی ممتاز کتابیں اور مرثیے پر کئی مضامین سامنے آئے۔اِس مضمون کی شروعات میں بتایا گیا تھا کہ نیر مسعود خود کو کسی تحریک سے وابستہ نہیں کرتے تھے، اس کی مثال دینے کا یہ مناسب مقام ہے۔۱۹۸۹ء میں شائع ہونے والی اپنی کتاب ''مرثیہ خوانی کا فن'' انھوں نے ترقی پسند تحریک سے وابستہ شاعر کیفی اعظمی کو تحفے میں بھیجی تھی۔کتاب ملنے کی رسید میں کیفی اعظمی نے جو خط لکھا تھا اُس کے دو حصے دیکھیے :

مجھے علم ہے کہ میرے اور آپ کے ادبی عقائد مختلف ہیں، اس کے باوجود مرثیہ اور میر انیس ہم دونوں کے محبوب ہیں۔ یہ تنقید کی کم نظری ہے کہ اس نے مرثیے کو صرف رونے رلانے کی چیز اور ایک فرقے کی میراث سمجھ رکھا ہے۔ میں مرثیے کا مطالعہ اس نظر سے کرتا ہوں کہ اردو میں احتجاجی شاعری کا بہترین نمونہ ہمارے مرثیے ہیں.................. میں نے بعض کتابوں میں دیکھا اور کچھ بزرگوں سے سنا ہے کہ غدر سے کچھ پہلے مجالسِ عزا میں صرف شیعہ نہیں، عام مسلمان اور بہت سے غیر مسلم بھی شریک ہوا کرتے تھے۔

ترقی پسند تحریک پر کام کرنے والے کے لیے یہ دیکھنا دلچسپ ہوگا کہ وہ کیا اسباب ہیں کہ جن کی بنا پر کیفی اعظمی اپنے اور نیر مسعود کے ادبی عقائد کو مختلف مانتے ہیں جبکہ دونوں کے یہاں ناانصافی کی مخالفت کرنے کا جذبہ موجود ہے۔ بہرحال اب تک کی بحث کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ نیر مسعود کی ادبی زندگی کا ایک خاص مقصد یہ تھا کہ اودھ کی تہذیب کی صحیح تصویر پیش کی جائے اور جو غلط اور گمراہ کن تحریریں ہیں اُن کی تصحیح کی جائے۔مضمون کے شروع میں نیر مسعود کو عمومی طور پر لکھنؤ کی نمائندگی کرنے والے افسانہ نگار ماننے کی روایت کا حوالہ آ چکا ہے۔اسی ضمن میں یہ اضافہ دلچسپ ہوگا کہ نیر مسعود نے خاص لکھنؤ اور اودھ کے موضوع پر متعدد مضامین تو لکھے لیکن کبھی خود کو ''لکھنؤ کا نمائندہ'' ہونے کی حیثیت سے پیش نہیں کیا۔اُن کے اِس التزام کی وجہ پر بات کرنے سے پہلے اُن کے کچھ مضامین کے عنوان

دیکھنے سے اندازہ ہوگا کہ اُن کی ادبی زندگی میں اودھ کس نوعیت سے مرکزی مقام رکھتا ہے: لکھنؤ کے تاریخی مقامات، مشرق کی پہچان، عہدِ شاہی کے لکھنؤ میں کائستھوں کی ایک شادی، ماضی کا لکھنؤ اور محرم کے شب و روز، پرانے لکھنؤ میں کشمیری مسلمانوں کی رسمیں، عہدِ شاہی میں لکھنؤ کی کہاریاں اور مہریاں، اودھ کی تہذیبی جھلکیاں، اودھ کی تہذیبی تاریخ، عہدِ واجدی میں لکھنؤ کی نمایاں شخصیتیں، اور نوابینِ اودھ کی ادبی خدمات۔ یہاں مضمون کے چوتھے حصے یعنی اودھ کی تہذیب کے حوالے سے ذرا اور تفصیل کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے کہ تہذیب پر گفتگو کرنا کیسا نازک کام ہے خاص کر اپنی تہذیب پر کیونکہ ذرا بے احتیاطی ہونے پر خودستائش اور self-righteousness کا تاثر پیدا ہو جاتا ہے۔ نیر مسعود کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی تحقیق و تنقید میں اودھ کی تہذیب کی تصویریں پوری آب و تاب کے ساتھ پیش کی ہیں لیکن اس پیشکش میں کہیں خودستائش اور self-righteousness کا اطلاق نہیں ہونے پاتا۔ اِس کی وجہ میری نظر میں، جو شاید حتمی نہ ہو، یہ ہے کہ کلاسیکی اردو ادب، مرثیہ، اور اودھ کی تہذیب پر قریب ۲۰ ر کتابوں اور تقریباً ۲۰۰ سے زیادہ مضامین میں نیر مسعود کلاسیکی اردو ادب کو نہ تو مثالی ثابت کرتے ہیں اور نہ نئے ادب سے اُس کا موازنہ کرتے ہیں اور نہ ہی کلاسیکی ادب اور اودھ کی تہذیب کو romanticize یا glorify کرتے ہیں۔ بہر حال اوپر دی گئی مضامین کی فہرست میں اور داستان، غزل اور مرثیے کے سلسلے میں جو مثالیں اِس مضمون میں پیش کی گئی ہیں اُن میں نیر مسعود کی ادبی زندگی کے کئی مقاصد کی نمایاں جھلک کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک آخری مثال دینے کے بعد میں اِس مضمون کے اختتامیہ پر پہنچ رہا ہوں۔ ۲۰۰۶ء میں انھوں نے اودھ کے آخری تاجدار سلطانِ عالم واجد علی شاہ کی غزلوں کے دیوان ''سخنِ اشرف'' کو مرتب کیا تھا۔ اس کام کی اہمیت اور ضرورت کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> اُن [واجد علی شاہ] کی زبان لکھنؤ کے سے شہر میں بھی مستند سمجھی جاتی تھی۔ وہ [واجد علی شاہ] اپنی تحریروں میں ان تکلفات اور صنعتوں سے کام نہیں لیتے تھے جو لکھنؤ کی شاعری کا طرۂ امتیاز تھیں۔ اِس لحاظ سے یہ دیوان [سخنِ اشرف] ایک انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔ اِس کی دوبارہ اشاعت کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے اِس آخری بادشاہ کی، جو قلم کا بھی بادشاہ تھا، ایک یادگار عام ہاتھوں میں پہنچ جائے۔

نیر مسعود کے اِس بیان میں بھی لکھنوی شاعری پر ''لفظوں کی بازیگری'' والے الزام کی تردید کی جھلک کو دیکھا جا سکتا ہے۔ واجد علی شاہ کی علمی اور ادبی زندگی اور اُن کی شخصیت کے حوالے سے نیر مسعود کے کاموں کی فہرست میں ''سخنِ اشرف'' کے علاوہ کئی مضامین اور کہانیاں شامل ہیں جن کا خاص مقصد یہی تھا کہ واجد علی شاہ اور اودھ کی تہذیب کی خوبیوں کو واضح کیا جائے۔ اودھ سے متعلق کہانیوں کے سلسلے میں نیر مسعود نے ساگری سین گپتا کو بتایا تھا:

> اُن کہانیوں کو باقاعدہ ایک مقصد سے لکھا تھا، ورنہ کسی مقصد سے کہانی لکھنے کا تو قائل نہیں ہوں

میں۔ ان کہانیوں میں دو باتیں تھیں۔ ایک تو واجد علی شاہ کو بدنام بہت کیا گیا، کہ بہت ہی برا آدمی تھا۔ اس میں کمزوریاں بھی تھیں، لیکن بعض بہت خوبیاں بھی تھیں۔ تو وہ، اور اُس سے پھر لکھنؤ، لکھنؤ سے اودھ، اودھ سے مسلم، ہندو، گویا پوری جو ہماری tradition ہے ہندوستان کی، اس کے متعلق ایک impression یہ ہو گیا ہے کہ بہت ہی decadent لوگ تھے، اور اگر نہ ہوتے تو انگریزوں کا قبضہ کس طرح ہو جاتا۔ اور نہ اب ہمارے بچوں کو کچھ بھی معلوم ہے کہ اس وقت کیا زندگی تھی اور کیا اس میں کوئی اچھائی بھی تھی، انھیں نہیں معلوم۔ بس یہ کہ بہت جاہل قسم کے، بڑے backward لوگ تھے۔ تو میں نے یہ سوچا کہ کچھ دلچسپ کہانیاں اس طرح کی لکھی جائیں کہ جن سے اندازہ بھی ہو کہ پہلے کی traditions کیا تھیں، اور ایک طرح کی ہمدردی اپنے ماضی سے پیدا ہو۔

اِس بیان میں نیر مسعود اودھ کی تہذیب کے متعلق اپنے کاموں کے مقصد کو واضح طور پر بیان کر رہے ہیں یعنی ''ہمدردی اپنے ماضی سے پیدا ہو''۔ اسی مقصد کو کلاسیکی نثر اور شاعری کے تعلق سے اوپر دی گئی مثالوں میں دیکھا جا چکا ہے، جس کو میں نے نیر مسعود کی ادبی زندگی کا بنیادی نظریہ قرار دیا ہے یعنی ''ہمدردانہ مطالعہ''۔ اِس مضمون کے اختتامیہ تک آنے کے لیے اوپر ''سخنِ اشرف'' کے سلسلے میں نیر مسعود کے بیان میں سے ہی میں ایک نقطہ نکال رہا ہوں۔ انھوں نے ''سخنِ اشرف'' کی دوبارہ اشاعت کا مقصد یہ بتایا ہے کہ یہ کتاب ''عام ہاتھوں میں پہنچ جائے۔'' نیر مسعود کی ادبی زندگی کو دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ادب کو ادیبوں کے محدود حلقے میں محصور رکھنا نہیں چاہتے تھے بلکہ ادب کو عوام تک زیادہ سے زیادہ پہنچانے کی بھی سعی کرتے تھے۔ اپنے اِس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے ادبی رسالوں تک خود کو محدود نہیں ہونے دیا بلکہ ہندوستان اور پاکستان کے اخباروں میں مضامین شائع کیے اور لکھنؤ ریڈیو اور ٹی وی پر پروگرام نشر کیے۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ ریڈیو سے نشر ہونے والے پروگرام کے سامعین کا حلقہ تحریر کے پڑھنے والوں کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہوتا ہے اور کئی لحاظ سے زیادہ متنوع بھی۔ نیر مسعود اِن تمام باتوں کا اپنے ریڈیو پروگراموں میں خیال رکھتے تھے۔ جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں تک ادب اور تہذیب کو پہنچایا جائے تا کہ ان پروگراموں کو سُن کر سامعین کے دل میں اودھ کی تہذیب اور کلاسیکی اردو ادب کے لیے عزت پیدا ہو۔ نیر مسعود نے تقریباً ۱۲۷/ ریڈیو پروگرام نشر کیے جن میں سے کچھ کے عنوان دیکھیے: پرانا شہر، مرثیوں کی تہذیبی اہمیت، میر انیس، چکبست، بیگم حضرت محل، محرم، لکھنؤ کے امام باڑے، کلامِ انیس میں قربانی کا تصور، میر انیس کی شخصیت، داستانی ادب، ماضی کی میراث: داستان گوئی اور لطیفہ بازی، اور میر انیس کی انفرادیت۔ ریڈیو پروگراموں کے یہ عنوان خود ہی ظاہر کر رہے ہیں کہ اِن موضوعات کا انتخاب ایک سوچے سمجھے مقصد کے تحت کیا گیا ہے۔

اِس پوری بحث کے بعد مضمون کے اختتامیہ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ نیر مسعود کی ادبی زندگی کے کئی مقصد تھے

جیسے: اردو کلاسیکی ادب کی اہمیت کو نظر انداز نہ کیا جائے، اودھ کی ادبی حیثیت اور اودھ کے تہذیبی سرمائے کی قدر کی جائے، اردو زبان کو ایک مذہبی اقلیتی فرقے کی زبان کی حیثیت سے محدود نہ ہونے دیا جائے، ادیبوں کے محدود حلقے کے باہر عوام تک ادب کو پہنچایا جائے، اور ادیبوں اور عوام کے دل میں اودھ کی تہذیب اور کلاسیکی اردو ادب کے لیے فخر، جستجو، اور عزت پیدا ہو۔ نیر مسعود کی بیشتر تحریروں میں اِن مقاصد کو متحرک دیکھا جا سکتا ہے چاہے وہ اُن کی تحقیق اور تنقید سے متعلق کتابیں اور مضامین ہوں، سیمینار میں پڑھے گئے مقالے ہوں، یا ریڈیو اور ٹی وی پر پیش کیے گئے پروگرام ہوں۔ یہاں میں ایک اعتراف یہ بھی کر لوں کہ یہ اختتامیہ میرے اِس مضمون کا خاتمہ ہے، نیر مسعود کی ادبی اور تخلیقی زندگی کے مقصدوں کی تلاش کا نہیں کیونکہ مذہبی تحریروں، نئی شاعری، نیا ناول، اور افسانہ نگاری کے متعلق نیر مسعود کی تحریروں کو اور خود اُن کے افسانوں کو میں نے اِس مضمون میں شامل نہیں کیا ہے۔ ظاہر ہے اِن تمام تحریروں کے مطالعے کے نتیجے میں کئی دوسرے مقصد بھی سامنے آئیں گے۔ فی الحال، مضمون کو میں اِس نقطے پر ختم کر رہا ہوں کہ اِتنے مقاصد کا پاس رکھنے کے باوجود نیر مسعود کہتے یہی تھے کہ اُن کو مقصدی ادب پسند نہیں ہے۔ اِس تضاد یہ بیان کو ''گذشتہ تہذیب'' اور ''کلاسیکی ادب'' کے مطالعے میں نیر مسعود کے بنیادی نظریے ''ہمدردانہ مطالعہ'' سے بخوبی ضم کیا جا سکتا ہے؛ یعنی ادب کو کسی مقصد کے خانے میں محدود کرنے سے بہتر ہے کہ اُس کا ہمدردانہ مطالعہ کیا جائے۔

مآخذ:

۱۔ محمد حسین آزاد، نیرنگِ خیال، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۷۸ء۔

۲۔ الطاف حسین حالؔی، مقدمۂ شعر و شاعری، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۲۰۰۷ء۔

۳۔ الطاف حسین حالؔی، حیاتِ سعدی، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۹۲۔

۴۔ نذیر احمد، توبتہ النصوح، لکھنو: منشی نول کشور، ۱۹۲۱ء

۵۔ نذیر احمد مراۃ العروس، دہلی: کتابی دنیا، ۲۰۰۳ء۔

۶۔ نذیر احمد بنات النعش، دہلی: کتابی دنیا، ۲۰۰۳ء۔

۷۔ میتھیو کمپسن، تقریظ بہ، توبتہ النصوح، نذیر احمد، لکھنو: منشی نول کشور، ۱۹۲۱ء۔

۸۔ سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ، ہماری شاعری: معیار اور مسائل، لکھنو: نظامی پریس، ۱۹۷۶ء۔

۹۔ نیر مسعود، ''ساگری سین گپتا: نیر مسعود سے ایک گفتگو''، منتخب مضامین، کراچی: آج کی کتابیں، ۲۰۰۹ء۔

۱۰۔ نیر مسعود ذاتی رجسٹر ''ادبیات''۔

۱۱۔ مکتوب کیفی اعظمی بہ نام نیر مسعود، مورخہ بہ تاریخ ۲۲ر جون، ۱۹۹۰ء۔

۱۲۔ نیر مسعود، خواہش زدہ تحقیق، منتخب مضامین، کراچی: آج کی کتابیں، ۲۰۰۹ء۔

۱۳۔ نیر مسعود ''لفظی رعایتیں اور لکھنوی شاعری''، ذاتی رجسٹر۔

۱۴۔ سخنِ اشرف، مرتبہ نیر مسعود۔

۱۵۔ نیر مسعود، رجب علی بیگ سرور: حیات اور کارنامے، الہ آباد: شعبہ اردو، الہ آباد یونیورسٹی، ۱۹۶۷ء۔

۱۶۔ نیر مسعود، ''رجب علی بیگ سرور کے نثری اسالیب''، ذاتی رجسٹر۔

۱۷۔ کلیم الدین احمد، اردو زبان اور فنِ داستان گوئی، لاہور: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۹۰ء۔

۱۸۔ عبدالحلیم شرر ''ہمارے شعراء کا معشوق''۔

۱۹۔ خلیق انجم، غالب کے خطوط، نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۸۵ء ۔

20۔ C.M. Naim, "Prize-Winning Adab: A Study of Five Books Written in Response to the Allahabad Government Gazette Notification." In: *Moral Conduct and Authority: The Place of Adab in South Asian Islam*. Barbara D. Metcalf, ed. Berkeley: University of California Press, 1984. Pp. 290-314

21۔ Ulrike Stark, *An Empire of Books*, Ranikhet: Permanent Black, 2007

22۔ Edward Said, *Orientalism*, New York: Pantheon Books, 1978.

23۔ Gail Minault, *Secluded Scholars: Women's Education and Muslim Social Reform in Colonial India,* Delhi: Oxford University Press, 1998

24۔ Laura Mason, *Sweets and Candy: A Global History,* Reaktion Books, 2018

25۔ Tim Richardson, *Sweets: A History of Candy*, Bloomsbury, 2008.